اقبال اور نظریہ وحدت الشہود

شگفتہ بخاری

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فکر اقبال کا مطالعہ کرتے ہوئے شدت سے ایک احساس جنم لیتا ہے کہ اقبال کی فکر ہمہ جہتی ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں اقبال کے خیالات اگر واضح نہیں تو ڈھکے چھپے انداز میں نہ ملتے ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ اقبال بہت تھوڑے وقت میں بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پر تحقیق کرنے والے دن رات فکر اقبال کے مخفی گوشوں کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

اقبال کے صوفیانہ نظریات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کہیں تو وہ وحدت الوجودی نظر آتے ہیں اور کہیں وحدت الوجود کے مخالف۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

اسلام کا ظہور عرب میں ہوا' اور جوں جوں اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا اور فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور اسلام عرب سے نکل کر غیر عرب دنیا میں پہنچا تو اس پر دوسرے مذاہب کا اثر ہونا ناگزیر تھا۔ اسلامی تہذیب پر براہ راست مسیحیت' نو افلاطونیت' بدھ مت اور ہندو فلسفے کا اثر ہوا۔ اگر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سب سے زیادہ اثر نو افلاطونیت کا ہوا ہے۔ نو افلاطونیت کا رنگ اسلام کے سادہ سے تصور توحید میں اس انداز سے گھلا کہ اس عام فہم سے تصور نے "وحدت الوجودی" رنگ اختیار کر لیا۔ شیخ محی الدین ابن عربی (637ھ 1240ء) نے وحدت الوجود کے مسئلے کو اس انداز سے پیش کیا کہ یہ مسئلہ تصوف کا پہلا اصول اور لازمی جزو بن گیا۔ وحدت الوجود کا یہی تصور ہمیں جدید فلاسفہ میں سپائی نوزا کے ہاں بھی ملتا ہے۔

وحدت الوجود کے نظریے سے ترک دنیا' بے عملی' بے فکری اور حد سے بڑھے ہوئے توکل اور قناعت نے عام انسان کو بھی سیدھے راستے سے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ چونکہ عام انسان کے لیے اس نظریے میں بڑی کشش تھی' اس لیے لوگ مسلسل بے عملی کا شکار ہوتے چلے گئے اور حد سے متجاوز توکل نے انسان کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنے کا سبق پڑھا دیا۔

ہندوستان میں صوفی سلسلے جو خاصے وقت تک رائج رہے' ان کا اثر ایران اور ایران کی علمی سرحد عراق تک تھا۔ قادریہ' سہروردیہ' اور چشتیہ سلسلے' جن میں صلح کل کا طریقہ رائج تھا' یہ تینوں سلسلے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ بعض صوفیاء اس میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ وہ دائرۂ اسلام سے بھی باہر آجاتے تھے۔

برصغیر پاک و ہند میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک ایسا فلسفہ پیش کیا جو وحدت الوجود

کے فلسفے کا ہر طرح سے مد مقابل تھا۔ جہاں تک ان دونوں فلسفوں کے معنی کا تعلق ہے تو وحدت الوجود کو توحید عینی اور وحدت الشہود کو توحید ظلی کہا جاسکتا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے دونوں فلسفے ذات خدا اور مخلوق کے تعلقات کو بیان کرتے ہیں:

"وجود یعنی ہستی حقیقی واحد ہے لیکن ایک ظاہر وجود ہے اور ایک باطن۔ باطن وجود ایک نور ہے جو جملہ عالم کے لیے بمنزلہ ایک جان کے ہے۔ اسی نور باطن کا پرتو ظاہر وجود ہے جو ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہر اسم و صفت و فعل کے عالم ظاہر میں ہے' ان سب کی اصل وہی وصف باطن ہے' اور حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت صرف ہے' جیسے امواج کی حقیقت عین ذات دریا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جملہ افراد کائنات تخلیقات حق ہیں۔ سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا' اور اس کثرت اعتباری کا وجود اسی وحدت حقیقی سے ہے۔" (تذکرۂ غوثیہ)

وحدت الشہود کا بیان یہ ہے کہ وجود کائنات اور ظہور آثار و صفات مختلفہ واحد مطلق کی ذات و صفات کا ظل و عکس ہے جو عدم میں منعکس ہو رہا ہے' اور یہ ظل عین صاحب ظل نہیں ہے بلکہ محض ایک مثال ہے۔

ان دونوں نظریات کو سامنے رکھیں تو ایک طرح سے یہ دو مختلف تعیناتی رجحانات کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں۔ نواب سر احمد حسین نظام جنگ بہادر اپنی کتاب فلسفہ فقراء میں بڑی خوبصورتی سے دونوں کے فرق واضح کرتے ہیں:

وحدت الوجود (ھوالکل)	وحدت الشہود (ھوالہادی)
نظریہ (ہمہ اوست)	نظریہ (ہمہ از اوست)
رجحان تصوف (سکون کی طرف مائل)	رجحان تصوف (جوش کی طرف مائل)
میں اور وہ جدا نہیں (وہ دریا تو میں قطرہ ہوں)	(اس کے ساتھ میں' اور میرے ساتھ وہ ہے)
وصل	عشق
اعتقاد: میں کون؟ انا الحق (عارف)	اعتقاد: (میں کون؟ انا عبدہ) عاشق

علامہ اقبال نے جب مسلمانوں' اور خصوصاً" برصغیر (پاک و ہند) کے مسلمانوں کی پستی اور زوال کے اسباب و علل پر غور کرنا شروع کیا تو ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ جمود' سکون اور بے عملی مسلمانوں کے زوال کا سبب تو ہیں ہی' اس پر ستم یہ کہ فلسفہ وحدت الوجود کی منفی تعلیمات بھی جلتی پر تیل کا کام کر رہی ہیں۔ علامہ کی طبیعت میں صوفیوں جیسی شان پائی جاتی تھیں۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ

> "میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے' اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہوگیا تھا' کیونکہ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی

خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا۔"

یہاں سے یہ اندازہ لگانا کہ اقبال سرے سے تصوف ہی کے خلاف تھے' غلط ہے۔ علامہ اقبال اسلامی تصوف کے زبردست حامی تھے' البتہ وہ تصوف کی غیر اسلامی تعبیر کے خلاف تھے۔ ان کے نزدیک اسلامی تصوف دلوں میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس کا مقصد انسان کا صفات الٰہیہ سے متصف ہونا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے اندر شان یکتائی کو بیدار کر سکے۔ غیر اسلامی تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے آپ کو مٹا دو' اپنی ذات کو فنا کر دو اور خودی کو گم کر دو۔ مسلمان' ذوق عمل سے بیگانہ' اسی غیر اسلامی تصوف کی تعلیمات کی بنا پر ہو گئے تھے۔ نظریہ وحدت الوجود کی تعلیم کے مطابق انسان موجود نہیں بلکہ موہوم ہے۔ جب انسان کا وجود سراسر دھوکا اور فریب ہے تو لامحالہ وہ جدوجہد اور عمل سے بیگانہ ہو جائے گا۔ اطاعت گزاری کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ جب فرد کی ہستی باطل ہو گئی اور اس کے وجود ذاتی کی نفی ہو گئی تو پھر اخلاقی ذمہ داری بھی ختم ہو گئی۔

علامہ اقبال نے قرآن کو اپنے نظریہ خودی کا منبع اور مصدر قرار دیا ہے۔ انہوں نے جب قرآن کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تو یہ راز ان پر منکشف ہوا کہ قرآن سر تا سر جہاد کی تعلیم دیتا ہے۔ رموز بے خودی میں اقبال نے حلیفہ بیان کیا ہے کہ ان کی مثنوی کا ایک ایک لفظ تعلیمات قرآنی پر مبنی ہے۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآن مضمر است
پردۂ ناموس فکرم چاک کن
این خیابان را ز خارم پاک کن
روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسہ پا کن مرا

علامہ اقبال پر جب یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مسلمان قوم کی بربادی کا واحد ذمہ دار نفی خودی کا عقیدہ ہے تو انہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں خودی کے اثبات کی اشاعت پر صرف کر دیں۔ اکبر الہ آبادی کے نام اپنے ایک خط 20 جولائی 1918ء میں علامہ اقبال وضاحت کرتے ہیں:

"..... میں اس خودی کا حامی ہوں جو سچی بے خودی سے پیدا ہوتی ہے یعنی جو نتیجہ ہے ہجرت الی الحق کرنے کا' اور جو باطل کے مقابلے میں پہاڑ کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔"

مگر ایک اور بے خودی ہے جس کی دو قسمیں ہیں:

1- ایک وہ جو عاشقانہ شاعری کے پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے' اور دوسری وہ قسم ہے جو افیون و شراب کا نتیجہ ہے۔

2- دوسری وہ بے خودی ہے جو بعض صوفیائے اسلام اور تمام ہندو جوگیوں کے نزدیک ذات انسانی کو ذات باری میں فنا کر دینے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ فنا ذات باری تعالیٰ میں

ہے نہ کہ احکام باری تعالیٰ میں۔

پہلی قسم کی بے خودی تو ایک حد تک مفید بھی ہو سکتی ہے مگر دوسری قسم کی بے خودی تمام مذاہب و اخلاق کی جڑ کاٹنے والی ہے' لیکن میں ان دونوں قسم کی بے خودی پر معترض ہوں' اور بس حقیقی اسلامی بے خودی میرے نزدیک ذاتی اور شخصی میلانات' رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔"

علامہ کے نزدیک انسان کی بڑائی اس میں نہیں کہ وہ اپنی خودی کی نفی کر دے بلکہ وہ اثبات و استحکام خودی کا درس دیتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی روپ میں انسانیت کے کمال درجے پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ انسان کی اپنی ایک پہچان ہے۔ وہ خالق سے الگ وجود رکھتے ہوئے خدا کا بندہ ہے جس کو اگر کمال حاصل کرنا ہے تو اپنے اندر شان یکتائی پیدا کرے۔ اپنی خودی کو سربلند کرے اور احکام خداوندی کی بجا آوری کرتے کرتے اس بلندی پر پہنچ جائے کہ خدا خود انسان کی رضا کا طالب ہو۔

اسی خودی کے درس کو اقبال نے اپنے نظریہ وحدت الشہود کی تفسیر بنایا ہے۔ اقبال کا میلان تصوف کی طرف ہے' لیکن تصوف کے نظریہ وحدت الشہود کی طرف' جس کی تعلیم شیخ احمد سرہندیؒ نے دی ہے۔ اقبال کا رجحان شروع میں وحدت الوجودی فلسفے ہی کی طرف تھا لیکن بعد میں غور و خوض کے بعد اور اپنی کوشش سے اقبال نے اس میں تبدیلی پیدا کی۔ اقبال قرآن کو علم کا ایک بڑا ماخذ مانتے ہیں۔ جب اقبال نے قرآن کا اچھی طرح مطالعہ کیا تو یہ راز ان پر منکشف ہوا کہ قرآن خیال کے بجائے عمل پر زور دیتا ہے اور اسی اصول میں قوموں کی بہتری کا راز پوشیدہ ہے۔ اسی ذوق عمل کو اپنی قوم سے متعارف کرانے میں علامہ اقبال نے اپنی تمام تر صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے کبھی شاعری کو اظہار کا ذریعہ بنایا تو کبھی نثر کو۔ وہ فلسفے میں فلسفہ خودی کا درس دیتے ہیں اور تصوف میں وحدت الشہود کا جس کا اصل مقصد جوش ہے اور جو وحدت الوجودی فلسفے کے مخالف ہے جو محض سکون کا پیغامبر ہے اور جس پر چل کر جمود لازم آتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی قوم پر مردنی چھائی ہو اور خدا کو منظور ہو کہ یہ قوم اس مردنی سے باہر نکلے تو وہاں کوئی نہ کوئی مصلح' کوئی لیڈر ایسا پیدا کر دیتا ہے جو قوم کے ناسوروں پر مرہم رکھنے کا کام کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی قوم کے مرض کی تشخیص کرلی کہ یہ قوم محکومی اور غلامی کے مرض کا شکار ہے تو انہوں نے دافع مرض دریافت کیا' اور وہ دوا نسخہ اثبات و استحکام خودی تھا۔

اسلام کی تعلیمات کو اگر غور سے دیکھیں تو ہمیں کہیں بھی یہ نظر نہیں آتا کہ انسان کو نفی خودی کی تعلیم دی گئی ہو۔ علامہ اقبال نے بھی یہ تعلیم دی کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔

قرآن پاک میں ہے "انی جاعل فی الارض خلیفہ" یعنی میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان بے پناہ تخلیقی قوتوں کا مالک ہے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین پر خلیفہ بنانے کے لیے چنا۔ اب انسان کو ہرگز ہرگز یہ زیب نہیں

دیتا کہ وہ اپنی ذات کی نفی کر کے فنا فی اللہ ہو جائے' بلکہ یہ کہ اس پر جو ایک عظیم ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ اس دنیا میں موجود رہ کر کاروبار حیات چلائے اور "فنا فی اللہ" کے بجائے "بقا باللہ" کو ترجیح دے۔ یہی خودی کا سبق ہے جو اقبال نے اپنی قوم کو دیا۔

علامہ اقبال نے بے خودی کے خلاف خودی' بے عملی کے خلاف عمل اور سکون و جمود کے خلاف حرکت کے تصورات کی اشاعت کی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ مسلمان قوم جس نے ایک عہد زریں اپنے کارناموں سے رقم کیا تھا' جب چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے حد سے بڑھے ہوئے ظلم و ستم نے ان کے اندر سے جوش و ولولہ چھین لیا اور وہ دنیا داری سے بیزار ہو گئے' ان کے اندر سے جینے کی آرزو یکسر ختم ہو گئی اور نئی نئی مصیبتوں نے انہیں اندیشہ ہائے روزگار میں مبتلا کر دیا تو انہوں نے گوشہ عافیت میں پناہ ڈھونڈنی شروع کر دی۔ اس قسم کے حالات کا اثر اس وقت کے ادب اور فلسفہ و فن پر ہونا بھی ناگزیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبیات فارسی نے اس زمانے میں اسی قسم کے تصورات کو اس انداز سے پیش کیا کہ پوری قوم پر جمود کی سی نیند طاری ہو گئی۔ اس جمود سے پیدا شدہ تساہل پسندی' حد سے بڑھی ہوئی کاہلی اور بے معنویت نے عام انسان کو بہت دیر تک اپنے چنگل میں پھنسائے رکھا۔

ہندوستان میں فلسفہ وحدت الوجود کی غیر اسلامی تعبیر کی اشاعت نے بہت لمبے عرصے تک خوب اپنا رنگ جمایا کیونکہ ہندوستانی مسلمانوں پر اس وقت کے حکمرانوں نے ظلم و ستم ڈھا ڈھا کر' اور ہر طرح سے انہیں پسماندہ رکھ کر تباہی کی عمیق گہرائیوں میں پہنچا دیا تھا جہاں سے مسلمان اگر چاہتے بھی تو نہیں نکل سکتے تھے۔ اس پر یہ کہ انہیں اگر سکون و جمود اور تساہل پسندی کی تعلیم ملتی تو یہ لازمی بات تھی کہ وہ پسند کی جاتی۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے نظریہ وحدت الشہود پیش کیا اور تصوف کو ایک نئی تعبیر دی جس کی رو سے انسان کو سکون کے بجائے جوش' وصل کے بجائے عشق کی تعلیم دی گئی جس میں انسان بندہ رہتا ہے اور عشق میں مبتلا' اور اسے تڑپ رہتی ہے وصل کی۔

وحدت الوجود کے قائل صوفیا خدا کی معرفت حاصل کرنے کی غرض سے اپنی خودی کو خدا میں گم کر دیتے ہیں۔ اقبال اپنی خودی کو برقرار رکھتے ہوئے حیات جاودانی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ وحدت الوجودی تصور وصال کے بجائے فراق کو ترجیح دیتے ہیں:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو' ہجر میں لذت طلب

علامہ نے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا:

"حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں ایک جگہ یہ بحث کی ہے کہ گسستن اچھا ہے یا پیوستن' یعنی فراق اچھا ہے یا وصال؟"

میرے نزدیک گسستن عین اسلام ہے اور پیوستن رہبانیت یا ایرانی (غیر اسلامی) تصوف ہے' اور میں اسی غیر اسلامی تصوف کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں..... آپ کو یاد ہو گا جب آپ نے مجھے "سر الوصال" کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے "سر الفراق" کہا

جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے کیا ہے۔ آپ کے تصوف کی اصطلاح میں اگر میں اپنے مذہب کو بیان کروں تو یہ ہوگا کہ شان عبدیت انتہائی کمال روح انسانی کا ہے' اس سے آگے اور کوئی مرتبہ نہیں ہے۔"

اقبال نے' وحدت الوجود' کے جامد اور ساکن نظریے کے برعکس جوش اور عمل کا نظریہ پیش کیا اور "سکون" کے فلسفے کو ترک کر کے ذوق عمل سے روشناس کیا۔ علامہ اقبال کے تمام فلسفے کا محور یہی نظریہ خودی ہے۔ وہ زینو کے نظریہ عدم حرکت پر بحث کرتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا بنیادی اصول حرکت مسلسل ہے۔ اگر کائنات کا بنیادی اصول حرکت ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ قومیں بغیر حرکت کے ترقی کریں۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اقبال کہتے ہیں: "ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے اسلام کائنات کے پرانے جامد و ساکن نظریے کا مخالف ہے۔ اس کا تصور کائنات حرکی ہے۔" حرکت اصول عمل ہے۔ حرکت کا یہی فلسفہ اقبال کو نظریہ "وحدت الشہود" کی تشریح و تعبیر کرنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کے فلسفے کے صوفیانہ پہلو کا منبع و مصدر یہی وحدت الشہود کا فلسفہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اقبال نے ایک سوئی ہوئی قوم کو جگانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ وہ ایک دردمند دل رکھتا تھا اور اس سے مسلمانوں کی حالت جو اس کے زمانے میں نہایت ہی دگرگوں تھی' دیکھی نہیں جاتی تھی۔ مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے اور ان کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کے لیے وہ مختلف زاویوں سے بھرپور کوشش کرتا ہے اور اپنی شاعری' نثر اور فلسفے سے مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔

+ + +

کتابیات

1- اقبال کی مابعد الطبیعیات، ڈاکٹر عشرت حسن انور
2- اسلامی تصوف اور اقبال، ڈاکٹر ابو سعید نور الدین
3- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، علامہ اقبال (ترجمہ نذیر نیازی)
4- حکمت رومی، خلیفہ عبدالحکیم
5- رومی و اقبال در حکمت قرآن، عمران لیاقت حسین
6- شرح اسرار خودی، (پروفیسر) یوسف سلیم چشتی
7- متعلقات خطبات اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ
8 مطالعہ بیدل فکر برگساں کی روشنی میں، علامہ اقبال (ترتیب و ترجمہ ڈاکٹر تحسین فراقی)
9- وحدت الوجود (اقبال کے اعتراضات کا ایک اجمالی جائزہ)
زیر تحریر کتاب "وحدت الوجود ——— مجدد الف ثانیؒ اور اقبال کی تنقید کا ایک مطالعہ" احمد جاوید
10- The Mujjaddid's Conception of Tawhid
By Dr. Burhan Ahmad Faruqi
11- رود کوثر، شیخ محمد اکرام
12- مکتوبات امام ربانی (حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ) ترجمہ: مولانا محمد سعید احمد نقشبندی
13- تاریخ فلسفہ جدید، ڈیکارٹ سے ہیگل تک، ڈاکٹر نعیم احمد
14- علامہ اقبال، افکار و خیالات - مرتبین مصباح الحق صدیقی: تسنیم کوثر گیلانی

180
180

اِقبال اکادمی پاکستان،
لاہور کی خصوصی پیش کش

کُلّیاتِ اِقبال

فارسی

(خاص الخاص ایڈیشن)

- اغلاط سے پاک۔
- مضبوط اور پائیدار جلد مع گولڈن ڈائی خوبصورت حاشیہ۔
- عُمدہ، معیاری کتابت۔
- درآمد شدہ اعلیٰ قسم کا کاغذ۔

قیمت : ۱۰۰۰ روپے

(ایک نسخے کی خریداری پر بھی ۴۰ فیصد شرح رعایت دی جائے گی۔)